© rasailojaraid.com

بینک سے تعاون، اور اس کے انٹرسٹ کا شرعی حکم؟

از: مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، استاذ حدیث و تفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

(۲)

لیکن اس کے باوجود، اجارہ، کا جواز قرآن وسنت سے ثابت ہے۔ حالانکہ اجنبیہ کو دیکھنا یا کرایہ پر کوئی چیز لینا ایسی ضرورتوں میں داخل نہیں ہے۔ جن کے ترک سے عموماً جان یا کسی عضو کے تلف ہونے کا خطرہ ہو، البتہ اسے حاجت کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اجنبیہ کو دیکھے بغیر (یا کسی رشتہ دار کو دکھائے بغیر) نکاح کر لینے سے اس کا امکان ہے کہ پوری عمر ضیق اور پریشانی میں گذارنی پڑے۔ اسی طرح کسی چیز کے (مثلاً مکان کے خریدنے کی طاقت نہ ہونے کی بنا پر اس سے فائدہ نہ اٹھا سکنے (جس کا امکان اجارہ سے ہو جاتا ہے) سے زندہ تو رہے مگر سخت پریشانی میں مبتلا رہ کر۔ موجودہ دور میں بینک سے (بعض حالات میں) تعاون حاصل نہ کرنا اس سے زیادہ پریشانی اور کلفت کا موجب ہو سکتا ہے جتنا کہ اجنبیہ کو دیکھے بغیر نکاح کر لینے یا اجارہ وغیرہ سے بچے رہنے سے ہوتا یا ہو سکتا ہے۔ اس لیے شریعت کا حکم۔ ایسی صورتوں میں یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ بینک سے ایسی مجبوریوں میں تعاون جائز ہے[ع]۔ چنانچہ

ع واضح رہے کہ مذکورہ بالا رائے ایک طالب علمانہ غور وفکر کا نتیجہ ہے اسے شخصی فتویٰ کا درجہ نہ دیا جائے اصحاب علم اور ارباب فتویٰ سے درخواست ہے کہ وہ اس پر اپنی گرانقدر علمی آراء سے راقم سطور کو مطلع فرمائیں، اور اسکی غلطی پر متنبہ کریں، احقر شکر گزار رہے گا۔ اگرچہ بعض علماء کی آراء کا تذکرہ آگے آرہا ہے جن سے احقر کی رائے کی تائید ہوتی ہے (فالحمد للہ علی ذالک)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بالغ نظر علمائے عصر میں سے متعدد نے ایسی صورتوں میں جواز کا فتویٰ دیا ہے بلکہ یہ کہنا غالباً مبالغہ نہ ہوگا کہ اس وقت عملاً ساری دنیا نے اس کا جواز تسلیم کرلیا ہے، یہاں تمام علماء کی رائیں اور فتویٰ نقل کرنا نہ صرف دشوار بلکہ غیر ضروری بھی ہوگا، اس لیے بس بعض قابل اعتماد علماء کی آراء نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

"ضرورۃ" اور "حاجۃ" کا فیصلہ علماء کی جماعت کرے

لیکن اس نقل سے پہلے ایک اہم بات کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہو رہا ہے، وہ یہ ہے کہ جن چیزوں کے "حاجت" یا "ضرورت" میں شامل ہوجانے کی وجہ سے رخصت دیئے جانے کا فیصلہ کیا جائے ان میں انفرادی رائے یا شخصی اجتہاد پر ہرگز دارومدار نہ رکھا جائے۔ کیونکہ محض ایک دو عالموں ــ خواہ وہ کیسے ہی متدین اور وسیع العلم ہوں ــ کی رائے کی بنیاد پر "حرمت" کو "حلت" سے بدلنا بہت غیر ذمہ دارانہ اقدام ہوگا، ہاں! جب بالغ نظر علمائے حقانی کی معتد بہ تعداد اس پر متفق ہو تب اس کا فیصلہ کیا جائے گا تو انشاء اللہ اس میں غیر غالب ہوگی۔ ورنہ سخت غلطی میں مبتلا ہو جانا مستبعد نہیں۔ خوش قسمتی سے مسئلۂ زیر بحث میں (بینک سے تعاون جائز ہونے کے بارے میں مذکورہ بالا مجبوریوں یا اس جیسی دیگر حالتوں کے اندر) بکثرت علمائے ربانی کی رائیں متفق ہوگئی ہیں، انہی میں عصر حاضر کے مشہور محقق حنفی شامی عالم علامہ مصطفی الزرقاء بھی ہیں، ذیل میں انہی کے افادات ــ خاص طور پر ــ پیش کئے جا رہے ہیں کیونکہ ہماری نظر میں اس موضوع پر سب سے زیادہ مفصل اور مکمل بحث علامہ موصوف ہی نے فرمائی ہے جسے خود موصوف نے علمائے عالم کے سامنے (سائیکلو اسٹائل کرواکر) ایک علمی مذاکرہ کے موقع پر پیش فرمایا تھا (تفصیل آگے آرہی ہے)

علامہ مصطفی الزرقاء کی رائے

موصوف ایک فاضلانہ تمہیدی بحث کرنے کے بعد سوال کے انداز میں فرماتے ہیں:-

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

هل إيداع النقود في المصارف الربوية جائز شرعًا أم محظور؟

کیا سودی بینکوں میں رقموں کا جمع رکھنا شرعًا جائز ہے یا نہیں؟

اس کے بعد خود ہی جواب دیتے ہیں :-

إن هذه الإيداع عن غير اضطرار هو محظور وعمل آثم لأن فيه تقوية للمصرف على المرابات وهذه التقوية هي إعانة على المعصية۔

اگر بغیر ضرورت کے رقمیں جمع کی گئی ہیں تو یہ گناہ کا کام ہے کیونکہ اس میں بینک کو سودی کاروبار میں تعاون دینا ہوگا۔ جو یقینًا اعانت علی المعصیۃ ہے۔

اس کے قبل موصوف یہ بات بھی ایک موقع پر فرما چکے ہیں :-

وإن أمكن القول بأن الإعانة على المعصية قد لا تبلغ في الإثم درجة المعصية المعان عليها ذاتها۔

اگرچہ یہ کہنا تو ممکن ہے کہ گناہ ہونے کے باوجود رقموں کا جمع رکھنا اس درجہ کا گناہ نہ ہو جتنا خود سود لینا یا سودی کاروبار کرنا۔

پھر فرماتے ہیں :-

هذا إذا لم يكن الإيداع في المصارف الربوية بلا اضطرار فإذا لم يكن هناك بد من هذا الإيداع إما لصيانة المال أو لحاجة أخرى مشروعة كتسهيل تداوله وتحويله إلى الجهات التي يراد تحويله إليها، فإن الوجه حينئذ يختلف والمودع عندئذ غير آثم۔

یہ گناہ جب ہی ہے کہ اس کو بلا ضرورۃ کیا جائے لیکن اگر بینکوں میں روپیہ جمع رکھے بغیر چارۂ کار نہ ہو خواہ مال کی حفاظت کی غرض سے، یا کسی اور معقول وجہ سے، مثلاً رقم کی منتقلی میں سہولت، یا لین دین کی آسانی وغیرہ تو اس صورت میں مسئلہ کی نوعیت بدل جائیگی اس صورت میں کھاتہ دار گناہ گار نہ ہوگا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موصوف اس کے بعد یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ آج کل جن مصلحتوں کی وجہ سے بینکوں میں روپیہ رکھا جاتا ہے انہیں "ضرورت" یا "حاجت" کا درجہ دیا بھی جاسکتا ہے یا نہیں؟ (کہ جس کی بنا پر گناہ نہ ہونے کا حکم لگایا جائے) پھر خود ہی جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

ان كل من له بصيرة في الاحوال والأوضاع الزمنية اليوم لايستطيع ان ينكر وجود حاجة عامة بالناس إلى ايداع وفر نقودهم في المصارف القائمة في بلدانهم لأن حفظ النقود في البيت أو المحال التجارية مخاطرة لا يفعلها ذو عقل ..... ودفن الاموال في المخابي ..... الأرضية هو اعظم خطرا ..... فأصبح إيداع الأموال في المصارف حاجة لازمة للناس ان لم تكن ضرورة لازمة۔

حالات زمانہ پر جس کی تھوڑی بہت نظر ہے وہ اس سے انکار نہیں کر سکے گا کہ اب بینکوں میں رقوم جمع رکھنا یقیناً حاجت میں داخل ہے، اسلئے کہ گھروں یا کوٹھیوں میں مال رکھنا خطرہ مول لینا ہے جسے کوئی بھی صاحب عقل گوارہ نہیں کرے گا، اور دفینوں کے طور پر مال رکھنا اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے تو اب بینکوں کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا ہے۔

اس کے بعد موصوف (جزاہ اللہ خیراً) ایک بہت ہی اہم بات یہ فرماتے ہیں، جسے ان کے دل کی اصل آواز سمجھنا چاہئے، ایسا دل جو تقویٰ اور خشیت خداوندی سے معمور ہو۔ فرماتے ہیں۔

اما الحاجة التي تنزل منزل الضرورة في الترخص فانها تبيح

مذکورہ بالا جس حاجۃ کو ضرورۃ کا درجہ دے کر بینکوں میں رقم رکھنا جائز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ولا توجب فلو صبر المکلف علی الحاجۃ وتحمل الضیق والمشقۃ لایکون عاصیا آثما۔

قرار دیا گیا ہے، بس وہ جواز کی حد تک ہی ہے، لازمی نہیں ہے، پس اگر کوئی شخص اصل حکم شریعت کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے اس سے دامن بچائے گا اور مشقت برداشت کرے گا تو وہ گناہ گار نہ ہوگا۔ (بلکہ امید ہے کہ وہ انشاء اللہ اجر کا مستحق ہوگا۔)

اور جب یہ مسلم ہے کہ اس طرح کے حالات میں سودی بینکوں سے تعاون لینا بدرجۂ مجبوری جائز ہو سکتا ہے تو اس کا لازمی تقاضہ ہے کہ یہ جواز بس اس حد تک ہی ہو جس پر حاجت اور ضرورت موقوف ہے، اس سے زیادہ جائز نہ ہو۔ چنانچہ علامہ موصوف بھی یہی فرماتے ہیں۔

فلا یجوز التجاوز عن مقدار ما تندفع بہ الحاجۃ او الاضطرار۔

حد ضرورۃ، یا حاجت، سے تجاوز جائز نہیں ہوگا۔

اسی لیے جب غیر سودی بینکوں کا قیام ہو جائے اور ان میں رقموں کا جمع کرنا اور ان سے دوسری خدمات لینا ممکن ہو تو پھر سودی بینکوں میں جمع کرنا اور ان سے تعاون قطعاً جائز نہ ہوگا، چنانچہ یہی بات ممدوح نے بھی بصراحت فرما دی ہے۔ جب یہ بات واضح ہوگئی کہ مجبوری اور عذر کی وجہ سے بینکوں میں روپیہ جمع کرنا اور ان سے تعاون بس اس حد تک جائز ہے جس کے بغیر چارہ کار نہ ہو، تو اس سے زائد حد میں جائز نہیں ہوگا، کیونکہ "الضرورۃ تتقدر بقدرھا" اور "ما جاز لعذر بطل بزوالہ" کا یہی تقاضہ ہے (اس قاعدہ کی تفصیل اور دلیل اوپر گزر چکی ہے)

بینک سے ملنے والے سود کا حکم بینکوں میں رقم جمع کرنے کے نتیجہ کے طور پر ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ بینک اپنے پاس رقم رکھنے کی صورت میں عموماً سود دیتا ہے اور قرض رقم دینے کی صورت میں وہ سود لیتا ہے۔ تو کیا بینک کا سود لینا اور دینا دونوں جائز ہوگا؟ یا ان میں سے کوئی ایک صورت جائز اور دوسری ناجائز ہوگی؟ یا دونوں ناجائز ہونگی؟

اوپر بیان کردہ اصولی بحث سے اس بارے میں بھی راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اور یہ حکم سامنے آتا ہے کہ اگر بینک سے قرض لئے بغیر اور کوئی چارۂ کار نہ ہو تو بقدر ضرورت وہاں سے قرض لیا جا سکتا ہے اور اس کے لازمی تقاضہ کے طور پر جو کچھ پیش آئے وہ بھی "اذا ثبت الشئ ثبت بلوازمہ" کے اصول سے (خاص حد کے اندر) جائز ہوگا۔ یعنی بدرجۂ مجبوری سود دینا بھی جائز ہوگا، لیکن ضرورۃً اگر بینک میں رقم جمع کرنا پڑے اور بینک کے اصول سے اس پر سود ملتا ہو تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کرنا چاہئے؟ کیونکہ بینک میں روپیہ جمع کرنا اگر بدرجۂ مجبوری اور اعذار کی وجہ سے بعض صورتوں میں جائز قرار پا جائے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سود لینے اور اسے استعمال کرنے کی بھی مجبوری ہو تو اس صورت میں رقم جمع کرنے والے کے لیے شریعت کا کیا حکم ہے؟

جدہ میں منعقدہ علمی مجلس مذاکرہ

یہی وہ سوال ہے جس کے حل کرنے کے لیے "البنک الاسلامی للتنمیة" (جدہ) کے لائق و فاضل مدیر نے ۱۳۹۹ھ / ۱۹۷۹ء میں ایک بہت محدود تعداد لیکن منتخب علمائے عالم پر مشتمل

عہ جیسا کہ شروع میں ذکر ہوا کہ بینک سے حاصل ہونے والی زائد رقم "سود" ہی ہے منفعت نہیں ہے۔ اسکے تفصیلی دلائل اور مباحث، نیز اشکالات کے جوابات کے لیے بکثرت چھوٹے بڑے مقالے و کتابیں لکھی جا چکی ہیں، جن میں حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ کی متعدد تحریریں اور ڈاکٹر فضل الرحمان گنوری صاحب (صدر شعبۂ سنی دینیات مسلم یونیورسٹی) کا فاضلانہ مقالہ "کمرشل انٹرسٹ کا جائزہ" شائع شدہ رسالہ "برہان" ۱۹۶۲ء دہلی (جواب کتابی شکل میں بھی "تجارتی سود" کے نام سے معہ اضافہ کے آگیا ہے) قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں مودودی صاحب نے اپنی کتاب "سود" میں بینک اور اس طرح کے تمام اداروں پر جو بحث کی ہے اسکے پڑھ لینے کے بعد کسی غلط فہمی کی گنجائش صاحب نظر کیلئے نہیں رہ جانی چاہئے۔ موصوف کی تحقیق سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معاشی فساد کی جڑ بینک ہی کا سود ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے افادات ان کی تفسیر "معارف القرآن" اور فقہی تحقیقات کے مجموعہ "جواہر الفقہ" وغیرہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مجلس مذاکرہ منعقد کی تھی، جس میں ساری دنیا کے ممتاز علماء کو دعوت دی گئی تھی (احقر کو بھی وہاں کی دعوت پر اس میں شرکت کرنے اور بحث میں حصہ لینے کی سعادت حاصل ہوئی تھی) مجلس کے انعقاد سے قبل اس کے دور اندیش اور بالغ نظر داعی (ڈاکٹر احمد محمد علی ڈائریکٹر "البنك الاسلامی للتنمیة" جدہ) نے عالمی شہرت کے حامل ممتاز فقیہ ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الزرقاء سے ایک نہایت محققانہ اور فاضلانہ علمی بحث تیار کرا کر مدعوین کے پاس (سائیکلو اسٹائل نقلیں) بھیجدی تھی، تاکہ اسکی روشنی میں بحث و مباحثہ کیا جاسکے (اوپر اقتباسات اسی بحث کے دیئے گئے ہیں اور آگے بھی اس کے حوالے آئیں گے) واضح رہے کہ اس مجلس مذاکرہ کی ضرورت پیش ہی اسلئے آئی کہ یہ مرکزی نقطہ سب کو تسلیم تھا کہ بینک کا "منافع" بھی "سود" ہی ہے (جس کا استعمال جائز نہیں) اس بارے میں کسی بھی شریک مجلس کو اختلاف نہیں تھا، اور جیساکہ آگے آرہا ہے۔ مجلس میں ساری دنیا سے منتخب علماء شریک کئے گئے تھے، اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ اکثر علمائے عالم کے درمیان یہ مسئلہ اتفاقی ہے۔

نصف صدی قبل علمائے ہند کا فتویٰ

لیکن اس سے بھی پچاس ساٹھ سال قبل ہندوستان کے بالغ نظر ارباب فتویٰ کے سامنے بھی یہ مسئلہ آچکا تھا (تقریباً ان سب نے اسے سود ہی بتایا تھا) شکر کا مقام ہے کہ جدّہ کے مجمع علماء میں جو کچھ طے ہوا وہ ہندوستان کے انہی قابل فخر علماء کی تحقیق و فیصلہ کی ہی گویا تائید تھی، بلکہ کہنا چاہیئے کہ برصغیر کے بالغ نظر علماء اپنی فقہی بصیرت اور خدا کی توفیق سے جس نتیجہ پر زائد از نصف صدی قبل پہنچ چکے تھے عالم اسلام کے ممتاز علماء نے اس کے مشابہ فیصلہ ــ عالم اسلام کے قلب میں بیٹھ کر ــ کر کے گویا بزبان حال ہندی علماء کی دور اندیشی اور بصیرت کا اعتراف کرلیا۔ یہاں یہ بتادینا غالباً بے محل نہ ہوگا کہ احقر نے اپنے اس مقالہ میں جو مجلس میں پیش کیا تھا، صراحت کے ساتھ ہندوستانی علماء کے نصف صدی قبل والے فتویٰ کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذکر کیا تھا جسے سن کر حیرت و مسرت کی ملی جلی کیفیت شرکاء کے چہروں سے ظاہر ہو رہی تھی، (اور فاضل داعی نے تو اس کا زبانی اعتراف و اظہار بھی کیا تھا) وہ فیصلہ یا فتویٰ کیا تھا؟ اس کا تفصیلی ذکر آئندہ سطروں میں آ رہا ہے۔ؔ اس مسئلہ میں شریعت کا اصل حکم دریافت کرنے کے لیے ضروری (یا مناسب) ہوگا کہ یہ دیکھا جائے کہ اس سلسلہ میں عقلی یا احکامی شکلیں کتنی ہو سکتی ہیں؟ معمولی غور و فکر سے معلوم ہو جاتا ہے کہ بس چار ہی شکلیں نکلتی ہیں۔ (۱) بینک سے سود وصول کر کے اسے اپنے استعمال میں لایا جائے۔ (۲) بینک ہی کے پاس سود چھوڑ دیا جائے۔ گویا اسے اختیار دیدیا جائے کہ وہ جہاں چاہے خرچ کرے۔ (۳) بینک سے سود کی رقم لے کر اسے تلف کر دیا جائے۔ (۴) بینک سے سود کی رقم لے کر فقراء پر تقسیم کر دی جائے یا کسی ایسے مصرف خیر میں اسے لگا دیا جائے جس سے براہ راست غرباء ہی فائدہ اٹھا سکیں۔ ایک امکانی شکل یہ اور ہو سکتی ہے کہ وہ رقم دولت مندوں کو دیدی جائے لیکن اس شکل کو الگ فرض کرنے کی ضرورت اس لیے نہیں کہ دولتمندوں کو دینا اور خود اپنے اوپر خرچ کرنا۔ اس مسئلہ میں دونوں۔ شرعاً۔ برابر ہیں، کیونکہ دولتمندوں کو اس رقم کا دینا شرعاً ہدیہ کہلائے گا۔ اور ہدیہ دینا۔ شرعاً۔ اپنے ذاتی مصارف میں خرچ کرنے کے حکم میں ہے، کیونکہ اس کا فائدہ دیر سویر (اسی دنیا میں) عموماً دینے والے کی طرف لوٹتا ہے۔ (یا اس کی توقع ہوتی یا کیجا سکتی ہے) تو ہدیہ دینا، نقد رقم سے سامان خرید کر خود استعمال کر لینے کے حکم میں ہوگا۔ ان چار امکانی حلول میں سے پہلا حل تو شرعاً جائز ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ اس کا مطلب تو سود لینا اور اسے استعمال کرنا (بلا ضرورۃ کے) ہے۔ ظاہر ہے کہ سود قرآن مجید کی آیات اور احادیث کثیرہ کی رو سے حرام ہے، اور اس میں علماء کی دو رائیں نہیں ہیں۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اگرچہ بعض حالات میں جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، بینک سے تعاون تو

ؔ احقر نے اس مجلس اور اس کے لیے سفر کے مختصر احوال ماہنامہ "الفرقان" ۱۹۶۹ء لکھنؤ، میں واپسی کے تھوڑی ہی مدت بعد شائع کرا دیے تھے جس کا عنوان تھا "رب کریم کے نفضل میں تین ہفتے"، البتہ مجلس کے تفصیلی مباحث اور فیصلے اس میں ذکر نہیں کیے جا سکے تھے اس کے لیے وعدہ کیا تھا جو آج بفضل خدا پورا ہو رہا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضرورۃ، یا حاجت، کے تحت جائز ہو جاتا ہے لیکن اس کا سود استعمال کرنے کی (خاص طور پر ایسے لوگوں کو جو بینک میں روپیہ جمع رکھنے میں مجبور ہیں) کوئی ضرورۃ یا حاجۃ عموماً نہیں ہوتی۔ (واضح رہے کہ "ضرورۃ" اور "حاجۃ" کی وہ حقیقتیں مراد ہیں جو شرعی اصطلاح کے اعتبار سے "ضرورت" و "حاجت" کا مصداق ہیں۔ عرفی ضرورتیں یا حاجتیں مراد نہیں ہیں کہ وہ سبب رخصت نہیں ہوتیں)۔

دوسرا حل، کہ سود کی رقم بینک ہی کے پاس چھوڑ دی جائے، اسے کچھ لوگ اگرچہ تقویٰ کا تقاضہ اور شریعت کے حکم کے مطابق سمجھتے ہیں اور بادی النظر میں ان کی رائے درست بھی معلوم ہوتی ہے لیکن گہری نظر سے دیکھیے۔ نیز بینکوں کے طریق کار کو (جو اس طرح کے رقموں کے سلسلہ میں ان کا ہوتا ہے) جان لینے کے بعد اس کے ناجائز ــ یا کم از کم ناپسندیدہ ــ ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا، کیونکہ یہ بات معتبر ذرائع سے معلوم ہے بلکہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ سود کی رقم وصول کرنے سے (بینک کے قواعد کے مطابق سود کا استحقاق رکھنے والا) کوئی اگر انکار کر دیتا ہے تو وہ رقم اس کے اصل[عـ۵] مستحقین کو (یعنی جن سے بینک نے سود وصول کیا ہے) بینک واپس نہیں کرتا، بلکہ اپنی صوابدید سے عموماً ایسے مواقع پر خرچ کر دیتا ہے جو ـ بینک کے منتظمین کے نزدیک خواہ بہترین مصارف ہوں مگر ـ اسلامی نقطۂ نظر سے قطعاً نامناسب اور بسا اوقات مضر ہوتے ہیں، بلکہ تجربہ یہ بھی ہے کہ تخریب اسلام کے لیے قائم شدہ بعض اداروں کو دیتا ہے۔ چنانچہ اس کی بکثرت نظیریں موجود ہیں۔ برطانوی ہند میں بینکوں کی طرف سے مسلمانوں کی جمع کردہ رقموں کے سود سے (مسلمانوں کے لینے سے انکار کر دینے کے بعد)، گرجا، بنوا دیا گیا، یا مشنریز کو تبلیغ عیسائیت کے لیے دیدیا گیا۔ (بلکہ ایک مسجد کی بینک میں جمع شدہ رقم کے سود سے گرجا بنوا دیا گیا تھا)، اس صورت حال کے سامنے آنے

عـ۵ بینک جو سود اپنے قرض خواہوں کو دیتا ہے دراصل وہ اس رقم ہی کا ایک جزو ہوتا ہے جو وہ سود کے طور پر قرض داروں سے وصول کرتا ہے۔ اور بعض اوقات تجارت کر کے بھی منافع کماتا ہے لیکن اس کا تناسب 'سود' کی مد میں وصول ہونے والی رقم سے بہت کم ہوتا ہے ــ مودودی صاحب کی تحقیق کے مطابق ۵ سے ۱۰ فیصدی تک، (ظاہر ہے کہ اسکی حیثیت گویا نہ ہونے کے برابر ہے) اس لیے فقہی اصول "الاکثر حکم الکل" (غالب کا حکم کل پر) کی رو سے بینک کی کل آمدنی کا حکم 'سود' ہی کا ہوگا (لیکن یہ حکم اس وقت ہوتا ہے جبکہ سب مال مخلوط ہو)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے بعد ہندوستانی علماء نے وہ فتویٰ دیا تھا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

اور آج اگر گرجا نہیں تو مندر تعمیر کرایا جاتا یا کرایا جاسکتا ہے یا کسی اور خلاف شریعت منصوبہ میں لگایا جاسکتا ہے، اس لیے سود کی رقم کا بینک میں چھوڑنا گویا مندر، یا گرجا بنانے یا تخریب اسلام میں حصہ لینے کے برابر ہوگا۔ اس لیے یہ شکل بھی جائز نہیں ٹھہرائی جاسکتی، کیونکہ اس میں "تعاون علی الاثم والعدوان" ہوگا۔ خواہ بالواسطہ اور بلا ارادہ ہی۔ اور اگر بالفرض یہ معلوم بھی ہوجائے کہ بینک اس رقم سے نہ مندر بنواتا ہے نہ گرجا، اور نہ ایسے کام میں صرف کرتا ہے جو تخریب اسلام کا سبب ہو تب بھی ایسی رقموں کو، کہ جن پر خود کو تصرف کرنے کا قانونی حق حاصل ہو، انہیں اپنی صوابدید سے کسی بہتر جگہ خرچ کرنے کے بجائے غیروں کے حوالہ کردینا عقلمندی نہیں ہے، خاص طور پر ایسے حالات میں جبکہ آئے دن مذہبی تعصبات کی بنا پر حقوق تلفی بلکہ کھلی زیادتی کے تجربے ہوتے رہتے ہیں۔

تیسرا حل، (کہ سود کی رقم لے کر تلف کردی جائے) معمولی عقل وفہم رکھنے والا بھی درست نہیں سمجھ سکتا۔ کیونکہ دولت، بہرحال خداوند تعالیٰ کی نعمت ہے جو فی نفسہ نجاست نہیں ہے بلکہ اس میں ناپاکی محض غلط ذریعہ سے حاصل ہونے کی بنیاد پر آئی ہے جس کی تلافی کی جائز اور بہتر شکلیں موجود ہیں، اس لیے اس کا ضائع کرنا نعمت خداوندی کا ضیاع ہوگا جو یقیناً حرام ہے۔ علامہ مصطفیٰ زرقاء نے کیا خوب کہا ہے:

فالمال النافع لاذنب له حتى نحكم عليه بالاعدام، فاتلافه اهدار لنعمة الله وهو عمل أخرق. والشريعة الاسلامية حكمة كلها لأن شارعها حكيم۔

نفع بخش مال کا کوئی گناہ نہیں ہے کہ اسے فنا کرنے کی سزا دیجائے، اسلئے اس کا تلف کرنا خدا کی نعمت کی ناقدری ہوگی اور نہایت ہی بے عقلی کی بات، حالانکہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعت تمام تر حکمت پر مبنی ہے۱

۱ مجلہ حضارۃ الاسلام ع ... ص

اصل مسئلہ کا صحیح حل جب یہ تینوں حل (یعنی چار امکانی شکلوں میں سے) تین غلط ہیں تو بس ایک ہی شکل (بینک سے لے کر فقراء و حاجتمندوں کو دیدینا) باقی رہ گئی، وہی دراصل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسئلہ کا حل اور اس سوال کا صحیح جواب ہے۔ اور اب کہنا چاہئے کہ اسے اتفاقی حل، (عرب وعجم کے علماء کے اتفاق پر مبنی حل) کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ اس سلسلہ میں یہاں پہلے بعض ہندوستانی فقہائے کبار کے چند فتاویٰ نقل کیے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد 'جدہ کے اجتماع' کی روداد کا ضروری حصہ پیش کیا جائے گا۔

تقریباً نصف صدی قبل دار العلوم دیوبند کے صدر مفتی حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحبؒ نے ایک سائل کے جواب میں تحریر فرمایا تھا "بینک میں روپیہ داخل کر کے جو کچھ بنام نہاد منافع رقم متعینہ سالانہ وہاں روپیہ داخل کنندہ کو ملتی ہے وہ شرعاً سود ہے لینا اس کا جائز نہیں[1] اور اگر لیا تو اس کو صدقہ کرنا فقراء پر لازم ہے[2]۔" اسی قسم کے متعدد فتاویٰ "مجموعہ فتاویٰ دار العلوم" میں مولانا موصوف کے موجود ہیں۔ (مثلاً دیکھئے ص ۲۹، ۳۳) اسی مجموعہ میں حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب (سابق صدر مفتی دار العلوم، و مفتی اعظم پاکستان) کا ایک فتویٰ بایں الفاظ ملتا ہے "اگر کسی نے بینک میں روپیہ جمع کر دیا تھا تو اس کا سود وہاں نہ چھوڑنا چاہئے۔ کیونکہ اس سے عیسائیت کی تبلیغ کیجاتی ہے، بلکہ وہاں سے لیکر فقراء و مساکین پر صدقہ کر دینا چاہئے، اپنے خرچ میں لانا جائز نہیں"۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے ایک فتویٰ[3] سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے کہ "بینک میں سودی رقم چھوڑنے سے اگر یہ خطرہ ہو کہ بینک ناجائز مصرف میں صرف کرے گا تو وہاں نہ چھوڑے بلکہ لیکر اہلِ حاجت کو دیدے۔" فتاویٰ رحیمیہ[4] جلد سوم ص ۲۶۳ تا ۲۶۵ کے آخر میں ہندوستان کے اور بھی متعدد اکابر علماء و اصحاب فتویٰ کے فتاویٰ اسی مضمون کے نقل کیے گئے ہیں کہ "بینکوں میں اگر

---

[1] یعنی سود کا لینا اصلاً ناجائز ہی ہے لیکن بینک سے سود لینے کا جواز (یا استحباب) اس خاص مصلحت سے ہوا ہے جسکا ذکر اوپر گذرا۔

[2] مجموعہ فتاویٰ دار العلوم دیوبند باب الربوا ص ۲۹ ج ۷-۸۔

[3] مشمولہ "امداد الفتاویٰ" ج ۳ ص ۱۳۳ مرتب مفتی محمد شفیعؒ (شائع کردہ پاکستان)۔ یہاں یہ وضاحت غالباً بے محل نہ ہوگی کہ یہ ساری گفتگو، دار الحرب، اور حربی، کے اموال سے متعلق جو بعض خاص احکام ہیں ان سے قطع نظر کرتے ہوتے کیجا رہی ہے۔

[4] مجموعہ فتاویٰ مولانا سید عبد الرحیم صاحب لاجپوری مدظلہ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضرورۃً روپیہ جمع کیا گیا ہے تو اس کا سود وہاں سے ضرور لے لیا جائے پھر مصرف خیر میں خرچ کر دیا جائے"
ان علماء میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مفتی کفایت اللہ رحمہما اللہ بھی ہیں، نیز عصر حاضر کے عظیم فقیہ علامہ مصطفیٰ الزرقاء اپنی بحث میں فرماتے ہیں:-

اذا كان المودع لدى المصارف الربوية لا يجوز له شرعاً ان يستبيح لنفسه أكل الفوائد التي يحتسبها له المصرف ولا أن يتركها للمصرف ...... فما التدبير الصحيح؟ والجواب على هذا السوال الوجيه كما أفتيت به ونا قشت الكثيرين ...... هو أن التدبير الصحيح الشرعي في هذه الفوائد أن يأخذها المودع من المصرف دون أن ينتفع بها في أي وجه من وجوه الانتفاع ..... فعليه أن يأخذ تلك الفوائد التي يحتسبها له المصرف الربوي عن ودائعه لديه ويوزعها على الفقراء حصراً ونصراً لأنهم مصرفها الشرعي۔

سودی بینکوں میں روپیہ جمع رکھنے والوں کیلئے نہ تو یہ جائز ہے کہ وہ بینک سے سود لے کر خود استعمال کر سکیں، اور نہ وہاں چھوڑنا (مذکورہ بالا مصالح کی بنا پر) درست ہے تو پھر آخر صحیح طریقہ کیا ہے جسے اختیار کیا جائے؟ اس کا جواب اور اس کا صحیح حل ایک ہی ہے اور (جس پر میری بہت سے علماء سے بحث بھی ہوئی ہے لیکن) میں تو یہی فتویٰ دیتا ہوں کہ بینک سے تو ضرور لے لیا جائے مگر اپنی ذاتی مصلحتوں میں ہرگز خرچ نہ کیا جائے بلکہ وہ پوری کی پوری رقم (جو سود کے طور پر بینک سے موصول ہوئی ہے) صرف فقراء ہی پر خرچ کر دی جائے۔ کیونکہ اس کا شرعی مصرف صرف وہی ہیں۔

ھ۵ متقدم الذکر کے ایک عربی مکتوب میں ہے: "افتی ..... بوجوب اخذ الربا" یعنی ایسے بینکوں سے سود لے لینا واجب ہے" کا فتویٰ اہل علم نے دیا ہے (مکتوبات شیخ الاسلام ص۱۹۰ ج۱۴)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علامہ زرقاء کی مذکورہ علمی بحث وتحقیق پر "جدہ" کے دو روزہ اجتماع میں غور وفکر کرنے کے بعد تمام شرکاء نے — جو مختلف مکاتب فکر سے متعلق، اور متعدد ملکوں کے علماء تھے۔ (عالم اسلام سے — سعودی عرب، مصر، الجزائر، اردن، عراق، شام کے اہم علماء کے علاوہ برصغیر سے حضرت عہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ نیز راقم سطور شامل تھے) بالآخر سب نے متفق ہو کر اس رائے کی تائید کی اور اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

بعض لوگوں کے ذہن میں یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جو مال اغنیاء کے لیے حلال نہیں وہ فقراء کے لیے حلال کیسے ہو گیا (حالانکہ شرعی احکام تو دونوں کے لیے یکساں ہیں)۔ اس سوال کا جواب ذرا تفصیل طلب ہے۔ (اس تفصیل سے ہی اس متفقہ رائے کی دلیل بھی سامنے آجاتی ہے)، جواب معلوم کرنے کے لیے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ بینک جو کچھ رقم سود کے طور پر دیتا ہے وہ اپنے پاس سے نہیں دیتا، بلکہ اس نے اپنے قرضداروں کو روپیہ دے کر اس پر جو سود وصول کیا تھا اسی موصولہ سود کا ایک حصہ سود کے نام سے ان لوگوں کو دیدیتا ہے جو اس کے پاس مقررہ مدت تک رقم جمع رکھتے اور شرطوں کو پورا کرتے ہیں جو بینک سود دینے کے لیے لگاتا ہے، بینک کے پاس وہ رقم جو اس نے سود کے طور پر دی، اس کی اپنی گویا نہیں تھی۔ البتہ اس کے قبضہ میں تھی، (کیونکہ سود کے طور پر وصول کیجانے والی نقد رقم یا مال پر — وصول کر لینے کے بعد بھی۔ شرعاً سود دینے ہی والے کا حق رہتا ہے۔[1] اور جیسا کہ پہلے گذر چکا اس کو لوٹانا ضروری اس لیے ہے)۔

عہ حضرت مولانا ابوالحسن مدظلہٗ صرف آخری نشست میں ہی — جس میں تجویز پاس ہوئی — شریک ہو سکے تھے۔ راقم سطور شروع سے آخر تک تقریباً پوری کارروائی میں شریک رہا۔

[1] یہ بات تو تمام ائمہ کے یہاں متفق علیہ ہے کہ وصول شدہ سود کا لوٹانا اصل مالک کی طرف ضروری ہے۔ البتہ ائمہ کا اس میں اختلاف ہے کہ قبضہ کے بعد سود کی رقم پر ملکیت، سود لینے والے کی قائم ہو جائے گی یا نہیں؟ اکثر کا مسلک یہی ہے کہ سود پر ملکیت بھی سود لینے والے کی قائم نہیں ہوتی لیکن اگر بالفرض یہاں بینک کی ملکیت تسلیم بھی کر لی جائے تو بھی مذکورہ بالا مصلحت کی وجہ سے سود کی رقم وہاں چھوڑنا درست نہ ہوگا یا کسی ذریعہ سے اگر یہ معلوم ہو گیا کہ بینک نے تجارت کی آمدنی سے سود دیا ہے تو بھی اس کا بینک کو لوٹانا۔ اسی مصلحت سے۔ مناسب نہ ہوگا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس بنا پر شرعاً بینک کے لیے یہ جائز ہی نہیں تھا کہ وہ رقم اپنے قرض خواہوں کو دیتا بلکہ جن لوگوں سے وصول کی تھی انہی لوگوں کو واپس لوٹانا اس پر ضروری تھا، مگر وہ اصل مستحقین کو لوٹانے کے بجائے اپنے ان قرض خواہوں کو دیدیتا ہے جو اس کے پاس رقم جمع رکھتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو بینک سے سود کے طور پر رقم ملتی ہے وہ اس رقم کے اصل مستحقین کو نہیں جانتے (اگر اصل مستحقین کا انہیں علم ہو جائے تو پھر انہی کو یہ رقم لوٹانا ضروری ہے) کسی مال کے اصل مستحقین کا علم نہ ہونے کی صورت میں اس کا صدقہ کرنا شرعاً واجب ہے۔ گویا یہ شخص اصل مستحق کی طرف سے از جانب شریعت نائب مقرر کیا گیا ہے، اور یہ اصل مالک کی طرف سے صدقہ کر رہا ہے، اسلئے اصل صدقہ کرنے والا یہ نہیں ہے بلکہ جو اس رقم کا اصل مستحق ہے وہی صدقہ کرنے والا بھی ہے۔ اس طرح فقیر کے پاس وہ رقم گویا اصل مالک کی طرف سے بالواسطہ صدقہ کے طور پر پہنچتی ہے، ظاہر ہے کہ جب صدقہ فقیر کے لیے حلال ہے تو اس رقم کا استعمال کرنا بھی اس کے لیے حلال ہوگا۔ صرف سود ہی نہیں بلکہ ہر حرام ذریعہ سے حاصل ہونے والی رقم کا (بلکہ ایسے تمام اموال کا) یہی حکم ہے کہ اولاً تو اصل مالک کی طرف لوٹانے کی کوشش کرنی چاہیے، اگر کوشش کے باوجود اصل مالک (یا اس کے قائم مقام) کو لوٹانا کسی وجہ سے ممکن نہ ہو (یا لوٹانا مصلحت شرعی کے خلاف ہو) تو پھر اسے صدقہ کرنا ضروری ہے، اور یہ بات تقریباً تمام مکاتبِ فکر کے فقہا کے نزدیک مسلّم ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ کے فتاویٰ میں ہے:۔

سئل عن رجل مراب خلف مالاً	ایک ایسے شخص کے بارے میں امام ابن تیمیہؒ
وولداً وهو يعلم بحاله فهل	سے مسئلہ دریافت کیا گیا کہ جو سود لیتا
يكون المال حلالا للولد	تھا، مرنے کے بعد اس نے مال بھی
بالميراث أم لا. فأجاب	چھوڑا اور اولاد بھی۔ اولاد کو یہ بات
أما القدر الذي تعلم أنه	معلوم ہے کہ باپ کا مال سود سے
ربا فيخرجه اما أن يرده	حاصل شدہ ہے تو اولاد کیا کرے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

إلى صاحبه إن أمكن وإلا تصدق به۔ [1]

اس کا جواب امام نے دیا کہ سود سے حاصل شدہ معلوم مال کے بقدر اصل مالک کو لوٹا دے اگر مالک کا پتہ نہ چل سکے تو صدقہ کر دے۔

مجموعہ فتاوی ابن تیمیہ میں اس طرح کے متعدد سوالات ملتے ہیں جن کا جواب علامہ نے یہی دیا ہے (مثلاً دیکھئے ج ۲۹ ص ۳۰۸-۳۰۹) ۔ تفسیر "جامع احکام القرآن" للقرطبی میں مالکیہ کا بھی یہی مسلک نقل کیا گیا ہے :۔

قال علماؤنا ان سبیل التوبة من بیده من الاموال الحرام ان كانت من ربا فلیردها علی من اربی علیه ویطلبه ان لم یكن حاضرا، فان أیس من وجوده فلیتصدق بذلك عنه وان اخذه بظلم فلیفعل كذلك فی أمر من ظلمه۔ [2]

ہمارے علماء (مالکی علماء) کا کہنا ہے کہ جس شخص کے قبضہ میں حرام ذرائع سے حاصل شدہ مال ہو اس کی توبہ یہ ہے کہ اگر سود کے طور پر مال حاصل کیا ہے تو اسے واپس کر دے جس سے لیا ہے، اگر موجود نہ ہو تو اسے تلاش کرے، ملنے سے مایوس ہو جانے پر صدقہ کر دے، اسی کی طرف سے۔ کسی اور طریقہ سے ظلم کر کے مال حاصل کیا ہے تو وہ مال بھی مظلوم کو لوٹا دے، نہ ملے تو صدقہ کر دے۔

(جاری)

---

[1] فتاوی ابن تیمیہ ج ۲۹ ص ۳۰۸ ۔ [2] تفسیر قرطبی ج ۳ ص ۳۶۶

© rasailojaraid.com